تسلسل
غلام محمد قاصر

"غلام محمد قاصر جانا پہچانا شاعر ہے۔ یہ بھی ستم ظریفی سے کم نہیں کہ شاعر جو شاعری میں کسی طرح قاصر نہیں تخلص میں قاصر ہے۔ کسی زمانے میں شاعرانہ تعلّی کا رواج تھا اور شاید اب بھی کہیں کہیں اہلِ ادعا پائے جاتے ہیں لیکن یہ شاعر خواہ مخواہ انکسارِ غیر شاعرانہ کا مرتکب ہے۔ وہ اگر اپنا تخلص کامل رکھ لے تو اس کی وجہ سے اس میں اور اس کی شاعری میں تضاد واقع نہ ہوگا....."

ــــــــــ ڈاکٹر سید عبداللہ

"....اُن کے شعر پڑھ کر ایک ہاتھ سے سر کھجانا اور دوسرے ہاتھ سے قلب کو سنبھالنا پڑتا ہے۔ قاصر کا اسلوبِ بیان، میر کی سادہ بیانی، غالب کی تخیل آفرینی اور اقبال کی وسیع نظری کے اُفق سے سرشار ہو کر اُبھرتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ اُستاد ہیں، اُن کی ابتدائی کوششوں میں بھی پختگی ہے۔"

ــــــــــ صوفی تبسم

"غلام محمد قاصر کو میں تحسین کا مستحق خیال کرتا ہوں کہ وہ مجھ سے دُور رہ کر بھی شاعروں کی اس صف میں نظر آتے ہیں جہاں انسان ایک عمر کے بعد پہنچتا ہے۔ قاصر صاحب کا پیرایۂ اظہار رجعت پسندانہ نہیں وہ جدید اسلوبِ نگارش کے آدمی ہیں......"

ــــــــــ احسان دانش

"....قاصر صاحب ایک جدید شاعر ہیں۔ وہ لفظوں کے نئے رشتے اور نئے معانی تلاش کرتے ہیں۔ تراکیب میں تخلیق کاری دکھاتے ہیں۔ تیز رفتار شعوری عمل کو ایمائیت اور اجمال کے سانچوں میں ڈھالتے ہیں اور موضوع کے اعتبار سے انفس سے آفاق تک پھیلے دکھائی دیتے ہیں۔"

ــــــــــ ظہیر کاشمیری

"غلام محمد قاصر کی شاعری ایک ایسے سیاح کے سفرنامہ کی حیثیت رکھتی ہے جس نے انفس کے بندابنوں کی سیاحت بھی کی ہے اور آفاق کے ہفت خواں بھی طے کیے ہیں اور پھر اس دوگونہ تجربے کو اپنے جذبے کی حدت اور فکر کی رفعت ارزانی کر کے ایسے شعر تخلیق کیے ہیں جن میں سمندر کی سی گہرائی اور وسعت کا بیک وقت احساس ہوتا ہے........"

ــــــــــ عارف عبدالمتین

"....ان کی شعری زندگی ایک خوبصورت خوش خرام مگر شاید خاموش جوئے رواں کی طرح پُرسکوت کوہساروں میں بہتی رہی ہے۔ اس جوئے رواں کی ایک موج نیا مجموعہ تسلسل بھی ہے..."

ــــــــــ رئیس امروہوی

تسلسل

تسلسل

غلام محمد قاصر

مکتبۂ فنون
انارکلی، لاہور

جملہ حقوق بحق مصنف محفوظ ہیں

بار اوّل : دسمبر ۱۹۷۷ء

ناشر : مکتبہ فنون، لاہور

کتابت : عبدالمتین

سرورق : اسلم کمال

مطبع : نقوش پریس، لاہور

تعداد : ایک ہزار

قیمت : اٹھارہ روپے

والدہ مرحومہ کے نام

ایک حلقہ اِس کا تُو ہے دوسرا حلقہ ہوں مَیں
دُور تک پھیلا ہُوا ہے سلسلہ زنجیر کا

ترتیب

غزلیں

نظمیں

تسلسل کا شاعر

ادب پڑھنے والوں کو نئے غزل گوؤں سے شکایت ہے کہ قریب قریب سبھی شعرا ایک سی غزل کہتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ لوگ اس صد فی صد غلط نتیجے پر کیسے پہنچے۔ ایک ہی وجہ ہو سکتی ہے کہ انھوں نے ان غزلوں کو رُک رُک کر اور ڈوب ڈوب کر نہ پڑھا ہو۔ بصورتِ دیگر یہ کیسے ممکن ہے کہ جہاں ایک نوجوان غزل گو کے ہاں تنوع کے چمن کھل رہے ہوں، وہاں سبھی شعرا کے موضوع و اسلوب کی یکسانیت کا شکوہ کیا جائے! یہ لوگ سبھی کو نہیں تو صرف غلام محمد قاصر ہی کو غور اور محبت سے پڑھ لیں۔ وہ محسوس کریں گے کہ اگرچہ قاصر غزل کی سی قدیم صنف میں اظہار کرتا ہے مگر اس کے موضوعات، بات کہنے کے انداز، بیسویں صدی کو اپنے جلو میں لے کر چلنے کے تیور، تشکیک و تذبذب میں معلّق عصر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یقین و اعتماد کے ساتھ نغمہ گری، اپنی علاقائی

اور پھر وطنی خصوصیات کو پورے کرۂ ارض سے مربوط کر دینے کے حوصلے ـــــ یہ سب قاصر کی منفرد پہچانیں ہیں اور ان سب پر مستزاد اس کے لہجے کا کھرا پن ہے جو شاعر کے ڈیرہ اسماعیل خاں سے لاہور اور پھر مردان میں منتقل ہونے کے بعد بھی نہیں بدلا ـــــ یہ لہجہ جس میں صرف سچ بولا جا سکتا ہے ـــــ اور شاعری میں سچ بولنے کا فن سبھی کو نہیں آتا۔

قاصر نے جب بڑے بڑے شہروں اور وہاں کے ادبی گروہوں کے حوالے سے اپنی ذات کا جائزہ لیا تھا تو کہا تھا:

یہ چالاکوں کی بستی تھی اور حضرت شرمیلے تھے

اور یہ حضرت اب تک بظاہر شرمیلے ہیں مگر صرف گفتگو کی حد تک۔ لکھنے پر آئیں تو باطل کے جسم کا کوئی ایک مسام بھی ایسا نہیں ہوتا جس میں ان کا تیر ترازو نہ ہوا ہو۔ پھر شرمیلا آدمی مروجہ زبان میں نئے الفاظ کا اضافہ نہیں کرتا، نئی بحروں کو نہیں آزماتا، نئی ہیئتوں کے تجربے نہیں کرتا، ـــــ مگر قاصر یہ سب کچھ کرتا ہے۔ جو شاعر اظہار میں کوئی تکلف ہی نہ برتے اور جو سیدھی بات سیدھے انداز میں کہہ جائے اور جو روایت کا صرف اس حد تک احترام کرے، جس حد تک روایت، نئے فکر اور نئے طرزِ احساس کے راستے میں حائل نہ ہو اور اگر حائل ہو تو جو شاعر اِسے توڑ کر آگے بڑھ جائے وہ بڑا حوصلہ مند شاعر ہے اور شرمیلے لوگ ذرا کم ہی حوصلہ مند ہوتے ہیں۔ چنانچہ قاصر صرف اتنا سا شرمیلا ہے کہ مجلسی آداب کا خیال رکھتا ہے یا پھر اُس نے خود کو شرمیلا شاید اس لیے قرار دیا ہو کہ وہ چالاکوں کی چالاکیوں سے نفرت کرتا ہے، اور ان کے مقابلے

میں سر میلا رہنا ہی پسند کرتا ہے ۔

غلام محمد قاصر کا شروع کا کلام پڑھ کر بھی احساس ہوتا تھا کہ "ڈبرے" کا یہ شاعر غزل کی کسی نئی ڈائمنشن کی طرف بڑھ رہا ہے ۔ بعد میں جب اس کی غزلوں میں "دستک" کا لفظ بار بار وارد ہوا تو یہ بلیغ علامت اس حقیقت کا ثبوت بن گئی کہ آگے چل کر قاصر کے فن میں فکر و احساس کے کئی نئے در کھلیں گے ۔ اور اب ، جب کہ اس کے اس طرح کے اشعار سامنے آتے ہیں تو قاصر کی غزل کے امکانات اپنے پورے خد و خال کے ساتھ نمایاں ہو جاتے ہیں :

ساربان محو تھا سن سن کے سکوتِ صحرا
چیخ محمل سے اٹھی ریت کے کہرام کے ساتھ

جاگ اٹھے بت تو پرستش سے بھی راضی نہ ہوئے
شکمِ سنگ میں سوئے تھے کس آرام کے ساتھ

شاعر بات کہنے کے سلیقے سے پہچانا جاتا ہے ۔ چنانچہ آغاز میں قاصر کا ایک ایسا شعر میری نظر سے گزرا جو موضوع اور اس کے متعلقات کے لحاظ سے بظاہر روایتی تھا مگر جب کوئی سچ مچ کا شاعر بات کہنے کا اپنا سلیقہ روایت میں شامل کرتا ہے تو پوری روایت جگمگا اٹھتی ہے ۔ شعر یہ تھا :

تم یوں ہی ناراض ہوئے ہو ، ورنہ مے خانے کا پتہ
ہم نے ہر اُس شخص سے پوچھا جس کے نین نشیلے تھے

بات کرنے کا یہی قرینہ ہے جس نے قاصر کی انفرادیت شروع ہی میں نمایاں کر دی تھی ۔ اور پھر جب ... کہ آئینۂ ذات میں کائنات منعکس ہونے لگی ، تو یہ قرینہ اور

کے بہت کام آیا۔ اُس نے اپنے معاشرے پر طنز بھی کیا تو اسی شائستہ قرینے کے ساتھ، ورنہ جبڑا بھینچ کر اور مٹھیاں تان کر اس طرح کے اشعار نہیں کہے جا سکتے :

بیٹھے تھے زیرِ سایہ کچھ حق پرست ، ورنہ
میں تو گرا رہا تھا دیوارِ مصلحت بھی

بدن پہ روح کا ہر کرب لکھ رہے ہو تو کیا
وہ رل گیا تو توجہ لباس پر دے گا

نامراد لوٹ آئے خُوشبوؤں کے سودائی
پُھول سب گلستاں کے مبتلا تھے رنگوں میں

غزل کے علاوہ نظم میں بھی قاصر اس سادہ اور بے تکلفانہ اظہار پر قدرت رکھتا ہے۔ یہ سادگی اتنی پرکار ہے کہ قاصر کو پڑھتے ہوئے مجھے بار بار فراق کا یہ مصرعہ یاد آتا رہا :

اِک تیز چھُری ہے جو اُترتی چلی جائے

صرف اس کی "ایک ذاتی نظم" پڑھ کر دیکھ لیجیے جو دراصل اس کی ماں کا مرثیہ ہے (اور فنی لحاظ سے مکمل اور مؤثر مرثیہ ہے) مگر جس میں نئی ہیئت کے تجربے بھی ہیں اور جذبوں کی نئی تعبیروں کی فراوانی بھی ہے مگر انداز اتنا سادہ ہے کہ یہ سادگی ان لوگوں کو دھوکا دے جاتی ہے جو شعر کی صرف اُوپر کی

پرت دیکھ کر فیصلے صادر کرتے ہیں۔ میں غلام محمد قاصر کو ان چند نوجوان اہلِ قلم کے گروہ کا ایک اہم رُکن سمجھتا ہوں جنھوں نے ترقی پسند ادب کے گرد آلود ہوتے ہوئے معیاروں کو صیقل کیا، انھیں نئی چمک دی اور نئے دَور کے نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ کوئی بھی ادبی معیار جامد نہیں ہوتا بخصوصیت سے ترقی پسند ادب کے معیار تو زندگی اور انسان کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ بدلتے اور نکھرتے رہتے ہیں۔ جن نوجوان شعراء کو تغیر و انقلاب کے اس تسلسل کا شعور حاصل ہے، وہی ترقی پسند ادب کی عظیم تحریک کے اصل وارث ہیں اور غلام محمد قاصر کو اس ورثے کا شعور بھی حاصل ہے، وہ اس کے تحفظ اور اس میں اضافے کی اُمنگ بھی رکھتا ہے اور اپنے فن میں اس مبارک اُمنگ کو صورت پذیر کرنے کا حوصلہ بھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غیر معمولی حد تک حساس شاعر ہونے کے باوجود اندر سے ٹوٹا پھوٹا نہیں ہے۔ وہ ناساعد حالات اور حوصلہ شکن ماحول کا بوجھ محسوس کرتا ہے مگر اس کی اَنا شکست نہیں کھاتی۔

سمندِ آب پہ اک بُلبلہ سوار تو ہے!

بہت زور کی چوٹ پڑتی ہے تو دعا مانگ لیتا ہے:

یارب، مری نگاہ کی قوت بحال کر!

اور یہ اس خود اعتمادی کا نتیجہ ہے کہ وہ کتنے ہی جہنموں میں سے گزر کر بھی پُر اعتماد ہے:

جبیں پہ آنے نہ دیتے تھے اک شکن بھی کبھی
اگرچہ دل میں ہزاروں ملال رکھتے تھے

یہ کسی بھی صورت میں جبیں پر شکن نہ لانے کا کمال آسانی سے حاصل نہیں ہوتا۔ قاصرؔ کو یہ کمال حاصل ہوگیا ہے تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ شاعری اور شعور کے رشتوں رابطوں سے آگاہ ہے اور مستقبل کے فنی آفاق اسے اپنی طرف بڑھتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی

۲۰ر نومبر ۱۹۷۷ء
لاہور

غزلیں

○

شوق برہنہ پا چلتا تھا اور رستے پتھریلے تھے
گھستے گھستے گھس گئے آخر کنکر جو نوکیلے تھے

خارِ چمن تھے شبنم شبنم پھول بھی سارے گیلے تھے
شاخ سے ٹوٹ کے گرنے والے پتّے پھر بھی پیلے تھے

سرد ہواؤں سے تو تھے ساحل کی ریت کے یارانے
لو کے تھپیڑے سہنے والے صحراؤں کے ٹیلے تھے

تابندہ تاروں کا تحفہ صبح کی خدمت میں پہنچا
رات نے چاند کی نذر کیے جو تارے کم چمکیلے تھے

سارے سپیرے ویرانوں میں گھوم رہے ہیں بین لیے
آبادی میں رہنے والے سانپ بڑے زہریلے تھے

تم یوں ہی ناراض ہوئے ہو ورنہ میخانے کا پتا
ہم نے ہر اُس شخص سے پوچھا جس کے نین نشیلے تھے

کون غلام محمد قاصر بے چارے سے کرتا بات
یہ چالاکوں کی بستی تھی اور حضرت شرمیلے تھے

تم یوں ہی ناراض ہُوئے ہو ورنہ مے خانے کا پتا
ہم نے ہر اُس شخص سے پوچھا جس کے نین نشیلے تھے

عمل : اسلم کمال

ASLAM KAMAL

یوں تو صدائے زخم بڑی دُور تک گئی
اِک چارہ گر کے شہر میں جا کر بھٹک گئی

خُوشبو گرفتِ عکس میں لایا اور اس کے بعد
میں دیکھتا رہا تری تصویر تھک گئی

گُل کو برہنہ دیکھ کے جھونکا نسیم کا
جگنو بجھا رہا تھا کہ تتلی چمک گئی

میں نے پڑھا تھا چاند کو انجیل کی طرح
اور چاندنی صلیب پہ آکر لٹک گئی

روتی رہی لپٹ کے ہر اک سنگِ میل سے
مجبور ہو کے شہر کے اندر سڑک گئی

قاتل کو آج صاحبِ اعجاز مان کر
دیوارِ عدل اپنی جگہ سے سرک گئی

نظر نظر میں ادائے جمال رکھتے تھے
ہم ایک شخص کا کتنا خیال رکھتے تھے

جبیں پہ آنے نہ دیتے تھے اک شکن بھی کبھی
اگرچہ دل میں ہزاروں ملال رکھتے تھے

خوشی اُسی کی ہمیشہ نظر میں رہتی تھی
اور اپنی قوتِ غم بھی بحال رکھتے تھے

بس اشتیاقِ تکلم میں بارہا ہم لوگ
جواب دل میں زباں پر سوال رکھتے تھے

اسی سے کرتے تھے ہم روز و شب کا اندازہ
زمیں پہ رہ کے وہ سُورج کی چال رکھتے تھے

جنوں کا جام، محبت کی مے، خرد کا خمار
ہمیں تھے وہ جو یہ سارے کمال رکھتے تھے

چھپا کے اپنی سسکتی سلگتی سوچوں سے
محبتوں کے عروج و زوال رکھتے تھے

کچھ ان کا حسن بھی تھا ماورا مثالوں سے
کچھ اپنا عشق بھی ہم بے مثال رکھتے تھے

خطا نہیں جو کھلے پھول راہِ صرصر میں
یہ جرم ہے کہ وہ فکرِ مآل رکھتے تھے

○

اے محبت کے مؤرخ ہر حسیں کو بے وفا لکھ
نام اس بے مہر کا بھی بر سبیلِ تذکرہ لکھ

کل زمانہ جان لے گا اس کے باشندوں کے پیشے
آج تو شہرِ محبت کی فقط آب و ہوا لکھ

یوں چھپا سکتا ہے اپنے دور کی کم مائیگی تو
ایک گل کو گلستاں کہہ اک بشر کو قافلہ لکھ

سو گئے سارے مسافر منزلیں محوِ سفر ہیں
پھر بیاضِ رہگذر میں آہٹوں کا رتجگا لکھ

پیاس آنکھوں میں اُگا کر پانیوں کی نیتیں پڑھ
خواہشوں کے جسم پر اندھے کنوّیں کا ذائقہ لکھ

آرزو کی انگلیوں سے دھڑکنیں تحریر کر کے
اس نظر سے کہہ مرے شہکار پر اک تبصرہ لکھ

مدّتوں سے رہنے والے جانور قبضہ نہ کر لیں
گھر کی دیواروں پہ قاصرؔ نام اپنا جا بجا لکھ

ان کا عزمِ سفر دیکھتے ہی جھلملانے لگا اِک ستارہ
میری آنکھوں کا موسم جو بدلا مسکرانے لگا اِک ستارہ

اوس میں بھیگ جانے سے دن بھر گل کے اعضا جو دکھتے رہیں گے
شام ہی سے فلک کی ردا میں منہ چھپانے لگا اِک ستارہ

درد سے اپنے بس میں نہیں تھا چاند کی دسترس میں نہیں تھا
چاندنی کے برہنہ فسانے جب سنانے لگا اِک ستارہ

ہم زمیں پر ہیں یا آسماں پر کیا بتائیں بس اتنی خبر ہے
دل نے جب بھی کسی کو پکارا پاس آنے لگا اِک ستارہ

یہ ہوائیں یہ موسم یہ دھارے بادباں کھولنے کے اشارے
اُس کنارے سے کشتی کو ناصرؔ پھر بلانے لگا اِک ستارہ

پناہ مانگ کے بوسیدہ کاغذات سے وہ
ہوا میں آگ جلاتا ہے احتیاط سے وہ

چمن میں پھیلتی جاتی ہیں زرد تحریریں
اس آرزو میں کہ رکھ دے کتاب' ہاتھ سے وہ

ہر ایک راہ پہ انگلی پکڑ کے چلتا رہا
بچھڑ گیا ہے مگر پھر بھی اپنی ذات سے وہ

خفا تھے بحر سے کچھ ڈوبتے سفینے مگر
ہُوا ہے خشک' جزیروں کی واردات سے وہ

سحر ہوئی تو اندھیرے رگوں میں چلنے لگے
یہ شور تھا کہ بغاوت کرے گا رات سے وہ

زباں کی زد میں لبھے ہے ذائقہ جدائی کا
اسی لیے ہے گریزاں مذاکرات سے وہ

کشتی بھی نہیں بدلی دریا بھی نہیں بدلا
اور ڈوبنے والوں کا جذبہ بھی نہیں بدلا

تصویر نہیں بدلی، تیشہ بھی نہیں بدلا
نظریں بھی سلامت ہیں چہرہ بھی نہیں بدلا

ہے شوقِ سفر ایسا اِک عمر سے یاروں نے
منزل بھی نہیں پائی رستہ بھی نہیں بدلا

بیکار گیا بَن میں سونا مرا صدیوں کا
اس شہر میں تو اب تک سکہ بھی نہیں بدلا

بے سمت ہواؤں نے ہر لہر سے سازش کی
خوابوں کے جزیرے کا نقشہ بھی نہیں بدلا

اسے یہ معجزہ شام و سحر الجھن میں رکھتا ہے
بکھرتے منظروں کی راکھ جو دامن میں رکھتا ہے

کئی بادل چھوئے ہم نے کئی سیلاب چکھے ہیں
وہ رد کیے موسموں کا ذائقہ ساون میں رکھتا ہے

پرندے کیوں پسِ دیوار آکر چہچہاتے ہیں
اسے معلوم ہو گا پیڑ جو آنگن میں رکھتا ہے

وہی دل تیرے در آنے پہ سب کچھ بھول جائے گا
جو دستک کا قرینہ اپنی ہر دھڑکن میں رکھتا ہے

یونہی آساں نہیں ہے نور میں تحلیل ہو جانا
وہ ساتوں رنگ فاخر ایک پیراہن میں رکھتا ہے

جگمگاتے خوف کا ہر اک نشاں راہوں میں ہے
آگ منزل میں لگی ہے اور دھواں راہوں میں ہے

ہیں ابھی دشتِ طلب پر جسم و جاں سایہ فگن
اک زمیں راہوں میں ہے اک آسماں راہوں میں ہے

فتح کے فرماں رقم کرتی رہے گی خود ہوا
کیوں بکھرتے ہو اگر ریگِ رواں راہوں میں ہے

دستکوں کے سرخ پتھر آہٹوں کے زرد پھول
گھر میں بھی ہے رتجگوں کا جو سماں راہوں میں ہے

آنکھ سے آنسو رواں ہیں روئے جاناں پر نظر
قافلہ سالار پہنچا کارواں راہوں میں ہے

ڈھونڈ لیں گے گلستاں کو ظلمتوں کے سلسلے
جلتے بجھتے جگنوؤں کی کہکشاں راہوں میں ہے

گلابوں کے نشیمن سے مرے محبوب کے سر تک
سفر لمبا تھا خوش بُو کا مگر آ ہی گئی گھر تک
عکس: اسلم کمال
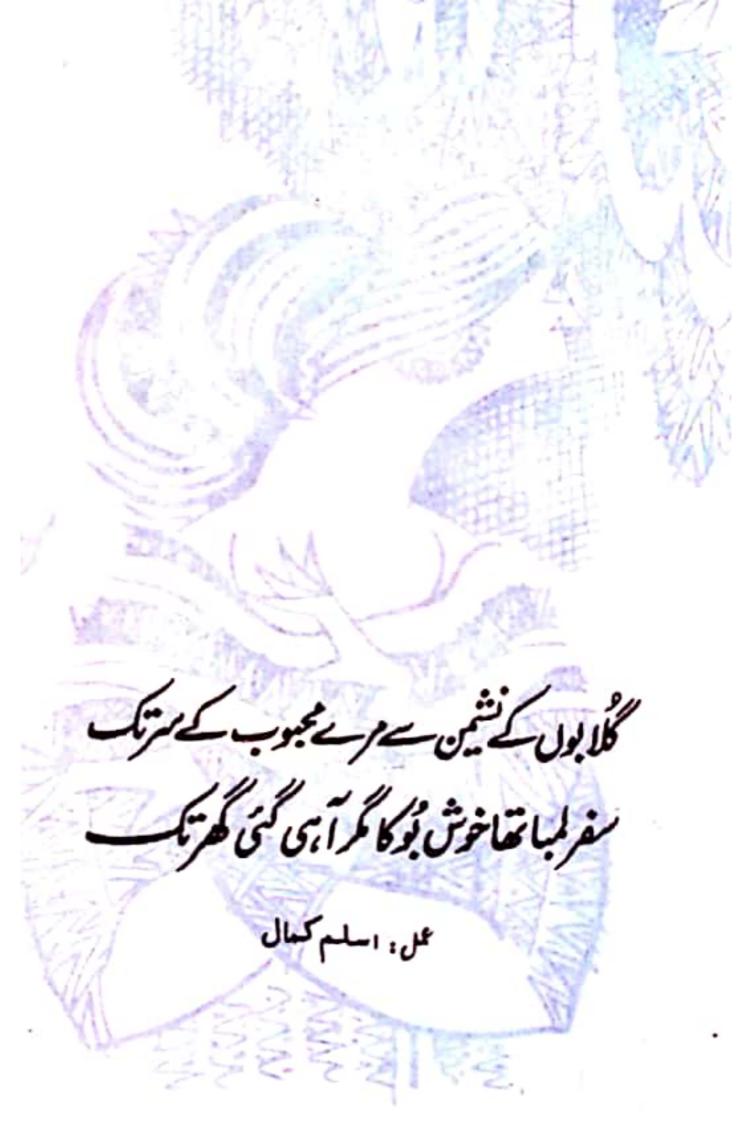
سفینۂ چشم جب بھی شفاف پانیوں پر سوار ہو گا
تو جھاگ کی آبرو رہے گی نہ ریت کا اعتبار ہو گا

خموش رہنا، بدن پہ ہنس ہنس کے اپنی خوشبو کے وار سہنا
چمن سے نکلا تو گُل کا یہ عیب خُوبیوں میں شمار ہو گا

وفا کی تجدید چاہتا ہے نظر کی تائید چاہتا ہے
سُنا ہے پھر اس کے سارے جلوُوں پہ عشق کو اختیار ہو گا

زمیں کے ہونٹوں پہ پیاس مچلے گی اور دیوارِ آسماں پر
سمندروں کی سخاوتوں کا سحاب سا اشتہار ہو گا

لہو کے غنچے کھلے سرِ شاخسارِ مژگاں تو بات ہو گی
وہ رات ہو گی کہ جس کے چاروں طرف سحر کا حصار ہو گا

حروف جب مُسکرا اُٹھیں تو وہ شکل پہچانتا ہے قادر
جو آپ رو رو کے لکھ رہے ہیں یہ خط اُسے ناگوار ہو گا

دل کو مشکل ہوا جب اُسے دیکھنا
آنکھ بولی کہ میرے لیے دیکھنا

دل میں خواہش کی شاخیں ہوئیں بے ثمر
گھر میں لٹتے ہوئے قافلے دیکھنا

اشک آنکھوں سے دامن چھڑانے لگے
ہجرتوں کے نئے سلسلے دیکھنا

گُل کے پنجرے میں جو بے سبب قید ہیں
ان بہاروں کو اُڑتے ہوئے دیکھنا

ایک چہرے کے جلوے بکھرنے تو دو
پھر یہ ٹوٹے ہوئے آئنے دیکھنا

دل کے اوراق میں اور کچھ بھی نہیں
اس نظر کے لکھے حاشیے دیکھنا

پہلے اِک شخص میری ذات بنا
اور پھر پوری کائنات بنا

حُسن نے خود کہا مصوّر سے
پاؤں پر میرے کوئی ہاتھ بنا

پیاس کی سلطنت نہیں مِٹتی
لاکھ دجلے بنا فرات بنا

غم کا سُورج وہ دے گیا تجھ کو
چاہے اب دن بنا کہ رات بنا

شعر اک مشغلہ تھا قاصر کا
اب یہی مقصدِ حیات بنا

عکس کی صورت دکھا کر آپ کا ثانی مجھے
ساتھ اپنے لے گیا بہتا ہوا پانی مجھے

میں بدن کو درد کے ملبوس پہناتا رہا
رُوح تک پھیلی ہوئی ملتی ہے عریانی مجھے

اس طرح قحطِ ہوا کی زد میں ہے میرا وجود
آندھیاں پہچان لیتی ہیں بآسانی مجھے

بڑھ گیا اس رُت میں شاید نکہتوں کا اعتبار
دن کے آنگن میں لبھائے رات کی رانی مجھے

منجمد سجدوں کی، یخ بستہ مناجاتوں کی خیر
آگ کے نزدیک لے آئی ہے پیشانی مجھے

ہجر کے تپتے موسم میں بھی دل ان سے وابستہ ہے
اب تک یاد کا پتا پتا ڈالی سے پیوستہ ہے

مدت گزری ۔ دُور سے میں نے ایک سفینہ دیکھا تھا
اب تک خواب میں آکر شب بھر دریا مجھ کو ڈستا ہے

شام ابد تک ٹکرانے کا اِذن نہیں ہے دونوں کا
چاند اُسی پر گرم سفر ہے جو سُورج کا رستہ ہے

تیز نہیں گر آنچ بدن کی جم جاؤ گے رستے میں
اُس بستی کو جانے والی پگڈنڈی یخ بستہ ہے

آیا ہے اِک راہ نما کے استقبال کو اِک بچہ
پیٹ ہے خالی، آنکھ میں حسرت، ہاتھوں میں گلدستہ ہے

لفظوں کا بیوپار نہ آیا اُس کو کسی مہنگائی میں
کل بھی قاصرؔ کم قیمت تھا آج بھی قاصرؔ سستا ہے

رہی میری نگاہوں کی حکومت اس کے چہرے پر
ٹھہر سکتی نہیں کوئی بھی رنگت اس کے چہرے پر

تلاشِ حسن میں محوِ سفر ہیں ایک مدت سے
جوانی میری آنکھوں میں، محبت اس کے چہرے پر

جدائی میں بہم ہوتی نہیں پہچان کی قوت
بصارت میری آنکھوں میں، بصیرت اس کے چہرے پر

شبِ وعدہ بس اک موہوم جذبے کی حرارت سے
چٹک کر کھل اٹھی صبحِ بشارت اس کے چہرے پر

بہانے اس کی باتوں میں، زمانے اُس کے ہاتھوں میں
فسانے اس کی آنکھوں میں، حقیقت اُس کے چہرے پر

اب اپنی بے سر و سامانیاں لکھ لکھ کے روتا ہوں
نہ پڑھتا کاش دل کی ہر ضرورت اس کے چہرے پر

دُعائے وصل تو دونوں کی عادت بن گئی ورنہ
نہ خواہش میرے سینے میں نہ حسرت اس کے چہرے پر

اسی سے لمحۂ موجود کا عرفان ممکن ہے
گئے وقتوں نے لکھی جو عبارت اس کے چہرے پر

نگاہوں کی طرح ناصرؔ مرے آوارہ بوسے بھی
کریں گے اختیار اک دن سکونت اس کے چہرے پر

مفہوم سو گئے ہیں خاموش ہے لغت بھی

سوچو تو ہے اسی میں لفظوں کی خیریت بھی

بیٹھے ہیں زیرِ سایہ کچھ حق پرست ورنہ

میں تو گرا رہا تھا دیوارِ مصلحت بھی

پہلے اُدھر نظر کا ہم نے سفیر بھیجا

پھر اُس نے فتح کرلی خوابوں کی سلطنت بھی

بوسیدہ سا مکاں ہے — یارو! دعائے باراں

منظور ہو گئی تو گر جائے گی یہ چھت بھی

چلّا رہی ہے خوشبو مالا پرونے والے

پھولوں میں گوندھ لائے کانٹوں کی معذرت بھی

ناصرؔ مرے بیاں کی تصدیق کر رہے ہیں

مقتول کی قبا پر قاتل کے دستخط بھی

کھلے گی رات اسی شام کے شگوفے سے
یہ کہہ سکا نہ میں ٹھکرا کے جلنے والے سے

یہ حادثہ ہے کہ ناراض ہو گیا سورج
میں رو رہا تھا لپٹ کر خود اپنے سائے سے

تجھے یقیں نہیں آتا تو مسترد کر دے
ورق نہ پھاڑ تمناؤں کے صحیفے سے

میں اس کو آبِ رواں میں تلاش کرتا ہوں
وہ جھانکتا ہے مجھے عکس کے دریچے سے

میں گن رہا تھا شعاعوں کے بے کفن لاشے
اُتر رہی تھی شبِ غم شفق کے زینے سے

سماعتوں کا سفر اور کیا عطا کرتا ؟
سجا رہا ہوں سبھی دستکیں قرینے سے

کچھ یوں دُھواں دُھواں سی ملی آرزو مجھے
شعلوں کے پار جیسے بلانا ہو تُو مجھے

خواہش، خمار، خوف، خرد، خواجگی، خراج
ہر رنگ میں ملا ہے خود اپنا لہو مجھے

چھانٹے خزاں نے شہر میں بانٹے بہار نے
کانٹے گئی رُتوں کے لگے سُرخرو مجھے

بینائی دیکھ آئی درندوں کے جسم پر
آتی تھی جس لباس سے یوسف کی بُو مجھے

ہتھیار ڈال دوں کہ وفا کے محاذ پر
بزدل سمجھ کے چھوڑ گئے جنگ جُو مجھے

ق

آنکھوں میں پانیوں کے فسانے لیے ہوئے
صحرائے تشنگی میں ملا آکے تُو مجھے

گُم صم کھڑے تھے سطح پہ سب دُوریوں کے عکس
دریا سُنا رہا تھا تری گفتگُو مجھے

ڈر کر شجر سے اُڑ گئی پتّوں کی ایک ڈار
تُو قتل کر رہا تھا مرے رُو برو مجھے

پھر یوں ہوا کہ ایک زمستاں زدہ درخت
جل جل کے گھورتا تھا لبِ آبِ جُو مجھے

○

میں نے مانا حدِّ نظر تک اس کی جلوہ نمائی ہے
اس سے آگے دیکھ سکو تو صرف مری بینائی ہے

جھیل کی آنکھ گواہی دے گی گو حائل گہرائی ہے
خاک کی نصرت کا پرچم ہے پانی پر جو کائی ہے

دل کے محاذ پہ فتح و شکست کا ہر معیار "اضافی" ہے
میں آگے کو بڑھتا جاؤں شوق کہے پسپائی ہے

ہتھیاروں کی شکل میں جس نے جنگوں کو تقسیم کیا
در پردہ اس نے بھی کیا تسلیم کہ امن اکائی ہے

اپنے گھر کی دیواروں کو بوسوں کے نذرانے دے
زائرِ اُلفت! اس کوچے کا ہر پتھر ہرجائی ہے

جو تاریک گھروندوں والے قحطِ ضیاء کی زد میں ہیں
سُورج تو خادم ہے ان کا لیکن دُھوپ پرائی ہے

ظُلم تو یہ ہے اس کی آنکھوں سے بھی جھُوٹ سُنا ہم نے
جس کی صورت اپنے دور کی سب سے بڑی سچّائی ہے

چاند جلانے لگا ڈسنے ہیں تارے مجھے
آج زمیں سے کیے کس نے اشارے مجھے

تیری نظر میں تھا میں تُو نے نظر پھیر لی
اتنی بلندی سے اب کون اُتارے مجھے

میں جو ہوں دریا تو پھر پیاسوں کے گھر جاؤں گا
قید میں رکھتے ہیں کیوں اپنے کنارے مجھے

میں جو اُجالے کروں کس کے حوالے کروں؟
دن جو اُجاڑے مجھے، شب جو سنوارے مجھے؟

برہمی جذبات میں اتنی کمی ذات میں
شہر کے سارے حسیں لگتے ہیں پیارے مجھے

○

ورائے بزمِ نجم و قمر اندھیرا دیکھتا ہی نہیں
دگرنہ شب سے تا بہ سحر تو کوئی فاصلہ ہی نہیں

زبانِ موج سے وہ سنا جو طوفاں نے کہا ہی نہیں
مگر حیف اس سفینے پہ جو ابھی تک ڈوبتا ہی نہیں

یہ غفلت ہے تو سیلِ بلا مری بستی میں آ ہی نہیں
یہاں گھر ڈوبنے پہ مُصر تجھے شوقِ تباہی نہیں

کئی پیغام آتے رہے گلستاں سے خزاں کی طرف
مگر آخر میں اپنا پتا کسی گُل نے لکھا ہی نہیں

نہ کرتا اکتسابِ ضیاء بنا تا تیرگی میں وہ گھر
مگر شاید ستارہ کوئی کنویں میں جھانکتا ہی نہیں

کہستاں کا جو گنجِ گراں چھپایا برف نے ہمہ شب
یہ وہ پتھر سمجھتے ہیں بس جنھیں تابِ گواہی نہیں

کبھی زردی جھلکنے لگی کبھی سُرخی برسنے لگی
کہ میرے روز و شب میں فقط سفیدی اور سیاہی نہیں

محبّت سے ہے طریقہ مرا کروں کیسے نظارہ ترا
جو پہنچے دل سے تا بہ نظر یہ ایسا سلسلہ ہی نہیں

تعارف ہے ضروری تو حُسن وہی قاصر ہوں میں مری جاں
جسے پہچاننا نہیں تو تجھے جو جاننا ہی نہیں

بہانے اس کی باتوں میں زمانے اس کے ہاتھوں میں

فسانے اس کی آنکھوں میں حقیقت اس کے چہرے پر

عمل : اسلم کمال

ASLAM
KAMAL

کہستاں کا جو گنجِ گراں چھپایا برف نے ہمہ شب
یہ وہ پتھر سمجھتے ہیں بس جنھیں تابِ گواہی نہیں

کبھی زردی جھلکنے لگی کبھی سُرخی برسنے لگی
کہ میرے روز و شب میں فقط سفیدی اور سیاہی نہیں

محبّت سے ہے طریقہ مرا کروں کیسے نظارہ ترا
جو پہنچے دل سے تا بہ نظر یہ ایسا سلسلہ ہی نہیں

تعارف ہے ضروری تو حُسن وہی قاصر ہوں میں مری جاں
جسے پہچاننا نہیں تو تجھے جو جاننا ہی نہیں

بہانے اس کی باتوں میں زمانے اس کے ہاتھوں میں
فسانے اس کی آنکھوں میں حقیقت اس کے چہرے پر

عمل : اسلم کمال

O

ہم نے تو بے شمار بہانے بنائے ہیں
کہتا ہے دل کہ بُت بھی خُدا نے بنائے ہیں

لے لے کے تیرا نام ان آنکھوں نے رات بھر
تسبیحِ انتظار کے دانے بنائے ہیں

ہم نے تمہارے غم کو حقیقت بنا دیا
تم نے ہمارے غم کے فسانے بنائے ہیں

وہ لوگ مطمئن ہیں کہ پتھر ہیں ان کے پاس
ہم خُوش کہ ہم نے آئینہ خانے بنائے ہیں

بھونرے انہی پہ چل کے کریں گے طوافِ گُل
جو دائرے چمن میں صبا نے بنائے ہیں

ہم تو وہاں پہنچ نہیں سکتے تمام عُمر
آنکھوں نے اتنی دُور ٹھکانے بنائے ہیں

آج اُس بدن پہ بھی نظر آئے طلب کے داغ
دیوار پر بھی نقشِ وفا نے بنائے ہیں

ہ

درد کی لہریں ہیں دل میں آنکھ زیرِ آب ہے
شہر کو پانی ڈبونے کے لیے بے تاب ہے

سب ادائیں تشنگی کی، سب دعائیں زیست کی
بند کمرے میں پڑی ہیں، صحن میں سیلاب ہے

سانس دریا ، زندگی کشتی ، بدن ہے بادبان
اس سفر میں ساحلوں کا تذکرہ نایاب ہے

بے ردا ، دامن دریدہ ، پا بجولاں ، سرنگوں
آج کس کو زندگی دیکھنے کی تاب ہے

چار جانب سر بریدہ حسرتوں کے مقبرے
آرزو، ہمزاد کی تسخیر کا اِک باب ہے

جس شاخ پر گلوں کی سکونت نہیں رہی
جو رِ خزاں سے وہ بھی سلامت نہیں رہی

غم دل میں یوں بسا کہ محبت نہیں رہی
تفسیر رہ گئی مگر آیت نہیں رہی

آہٹ رُکی تو نقشِ قدم بولنے لگے
محرم صوت کوئی بھی ساعت نہیں رہی

ہر شب طلوعِ خوف کی تصویر بن گئی
بطنِ اُفق میں صبح بشارت نہیں رہی

وہ چال چل کہ کل کا مؤرخ بھی کہے
اس شہر پر کسی کی حکومت نہیں رہی

اب فرش سے شعاعیں لپٹتی ہیں اس طرح
دیوار و در پہ جیسے کبھی چھت نہیں رہی

O

ایسے اسیر ہو گئے لوگ طلسمِ ذات میں
اب تو وہ اپنا نام بھی گننے لگے صفات میں

شہر کا کوئی رابطہ، دہر کا کوئی ضابطہ
کاش نہ دخل دے سکے دل کے معاملات میں

چہرہ شناس بھی ہے وہ اور اُداس بھی ہے وہ
چاند اُلجھ کے رہ گیا حسنِ جمالیات میں

صرف زمین پر بنے ظلمتِ شب کے زائچے
ورنہ فلک نہ تھا شریک کون سی واردات میں

آنکھ سے بدگماں ہیں ہم دل کے فراخ دل ہیں ہم
لے کے عصا ضمیر کا بیٹھے ہیں اپنی گھات میں

صوت و صدا کے پیڑ پر ایک ہی بات کھل سکی
ایک ہی ذات مل سکی ہم کو تو کائنات میں

ذہن میں نور ہو گیا آنکھ میں اشک ہو گیا
آج خیالِ یار بھی قید ہے ذات پات میں

بُت شکنی سے کیا ملا خود وہ بُتوں سے جا ملا
کہتے ہیں آج غزنوی بیٹھا ہے سومنات میں

۰

یاد اشکوں میں بہا دی ہم نے

آ کہ ہر بات بھلا دی ہم نے

گلشنِ دل سے گزرنے کے لیے

غم کو رفتارِ صبا دی ہم نے

اب اسی آگ میں جلتے ہیں جسے

اپنے دامن سے ہوا دی ہم نے

دن اندھیروں کی طلب میں گزرا

رات کو شمع جلا دی ہم نے

رہگزر بجتی ہے پائل کی طرح

کس کی آہٹ کو صدا دی ہم نے

قصرِ معنی کے مکیں تھے پھر بھی

طے نہ کی لفظ کی وادی ہم نے

غم کی تشریح بہت مشکل تھی

اپنی تصویر دکھا دی ہم نے

○

میری پلکوں پہ جلے ہیں جو ترے نام کے ساتھ
ان چراغوں کا تعلق ہی نہیں شام کے ساتھ

جن میں احوال تھے گزرے ہوئے سیلابوں کے
بہہ گئیں اب وہ کتابیں بھی در و بام کے ساتھ

سارباں محو تھا سُن سُن کے سکوتِ صحرا
چیخ محمل سے اُٹھی ریت کے کہرام کے ساتھ

معجزہ ہے کہ ابھی تیر رہے ہیں ہم لوگ
خود کو باندھا ہے بہت ڈوبتے اجسام کے ساتھ

جاگ اُٹھے بُت تو پرستش سے بھی راضی نہ ہوئے
شکمِ سنگ میں سوئے تھے کس آرام کے ساتھ

رُخِ زیبا کا اُڑا رنگ تو ٹوٹی یہ نظر
اس نے مجرم کو بھی رخصت کیا انعام کے ساتھ

○

الزامِ کشت و خوں تو مرے سر بھی آئیں گے
لیکن فلک نشین زمیں پر بھی آئیں گے

ظلمت میں جگنوؤں کے پروں کی کتاب پڑھ
لکھا ہے اب سحر کے پیمبر بھی آئیں گے

ویراں سمجھ کے شاخِ نشیمن نہ کاٹیے
شام آئی تو پرندے پلٹ کر بھی آئیں گے

کیوں روکتے ہو تشنہ لبی کے پڑاؤ پر
دریا کے راستے میں سمندر بھی آئیں گے

افواہیں مان لیتا ہوں گو ہے مجھے یقیں
لوٹے سفر سے وہ تو مرے گھر بھی آئیں گے

مشہور ہے وہ شہر سڑک تک تو آئیے
سمتِ سفر بتانے کو پتھر بھی آئیں گے

صحرا، طلوعِ صبح کا منظر، فقیر لوگ
پہلی کرن کے ساتھ قلندر بھی آئیں گے

ظلمت کا سحر تھا کہ وہ اعجازِ گرد تھا

کرنیں تو تھیں سفید مگر چاند زرد تھا

طے ہو سکے نہ دشتِ جدائی کے فاصلے

ہر چند اشک اشک بیاباں نورد تھا

تم کو جلا رہی تھی بہشتِ وفا کی آنچ

میرے لیے جفا کا جہنّم بھی سرد تھا

کیسے پہنچ گیا تری آنکھوں تک اشکِ غم

یہ بھی تو عاشقوں کے قبیلے کا فرد تھا

پھرتا رہا شعاعوں کا رختِ سفر لیے

خورشید تھا کہ وہ کوئی صحرا نورد تھا

چھیڑا سحر نے پھر مجھے قاصرؔ پکار کر

ورنہ تمام رات مرا نام درد تھا

○

کہتا ہے کون رو کے گزر جائے گی یہ رات؟
پلکوں کی سرحدوں پہ ٹھہر جائے گی یہ رات

سورج کی سمت جتنے مسافر روانہ ہیں
ساتھ اُن کے تا بہ حدِ سفر جائے گی یہ رات

بے کار ہے خلا میں ستاروں کا ٹوٹنا
ناداں سمجھ رہے ہیں کہ ڈر جائے گی یہ رات

اے عشقِ نامراد! تری عُمر ہو دراز
تُو مٹ گیا تو حُسن کے گھر جائے گی یہ رات

نقطے تجھے انتظار کے جن سے بنا ہے دِل
مرکز ہیں جس کا آپ وہی دائرہ ہے دِل

باقی ہیں راہِ عشق میں گو بے شمار موڑ
"سانول" مہار موڑ کہ اب تھک گیا ہے دل

کیسے کروں عبور وفا کے چناب کو
یہ تم بھی جانتے ہو کہ کچا گھڑا ہے دل

شاید وہ ایک حلقۂ زنجیرِ وقت تھا
لمحوں کے ساتھ ساتھ گزرتا گیا ہے دل

کرتا ہوں میں کسی کے خیالوں سے گفتگو
قاصرؔ کبھی جو ساتھ مرا چھوڑتا ہے دل

دِلوں کے شہر پہ شبخون مارنے والا

مجھے شکستِ نظر کے محاذ پر دے گا

عکس : اسلم کمال

○

ان کی آرزو شامل ہو گئی اُمنگوں میں
آج شمع بھی جل کر بل گئی پتنگوں میں

نامراد لوٹ آئے خوشبوؤں کے سودائی
پھول سب گلستاں کے مبتلا تھے رنگوں میں

چشمِ لطف پر مژگاں کس لیے صف آرا ہیں؟
کیوں یہ امن کی دیوی گھِر گئی ہے جنگوں میں

کانِ بے خودی یونہی کھودتے ہیں دیوانے
گوہرِ جنوں ہو گا ہوش کی سرنگوں میں

آنکھ شبنمی سی تھی، رُخ پہ برہمی سی تھی
آج کچھ کمی سی تھی سادگی کے رنگوں میں

دن کو بوتا رہا چہروں میں اُجالے سُورَج
رات کو کر گیا سب میرے حوالے، سُورَج

دائروں کو بھی کہیں دیکھنے والے سُورَج
گھر گیا چاروں طرف کھینچ کے ہالے، سُورَج

حاکمِ شب کے بلاوے پہ چلا جائے گا
شام کی جھیل میں کچھ دیر نہا لے سُورَج

لوگ کمزور عقیدوں کو گہن کہتے ہیں
اب گلے میں کبھی تعویذ نہ ڈالے سُورَج

جانشیں نجم و قمر ہی سرِ افلاک نہ ہوں
گر زمیں پر بھی ولی عہد بنا لے سُورَج

قید ہو جائے اندھیروں میں مگر قتل نہ ہو
ورنہ افلاک اُٹھا لائیں گے کالے سُورج

کس کو معلوم ہیں آدابِ نظر میرے سوا
ابر آجائے تو کرنوں کو بلا لے سُورج

چھپ کے بیٹھا ہے مرے عیب چھپانے والا
میں جونہی شمع بجھاؤں وہ جلا لے سُورج

○

چراغ جلتے ہوئے سائے رُخ بدلتے ہوئے
کبھی تو دیکھ تمنّاؤں کو مچلتے ہوئے

طلوعِ شامِ زمستاں، غروبِ مہرِ وصال
وہ برف جمتی ہوئی اور بدن پگھلتے ہوئے

رہِ وفا سے ہوس کا پڑاؤ دور نہیں
نظر نظر سے کہا فاصلوں نے ڈھلتے ہوئے

اُٹھائے پھرتے ہیں شیرینیوں کا رختِ سفر
لبوں کے قافلے بوسوں کے ساتھ چلتے ہوئے

خیال بزم میں پہنچا تھا گُنگناتا ہُوا
نگاہ چہرے سے لوٹی ہے ہاتھ ملتے ہوئے

گل ایک خار سے اُلجھا تھا اور اس کے بعد
صبا نے دیکھا اسے باغ سے نکلتے ہوئے

یہ زلزلوں کی زمیں، بارشوں کا موسم ہے
مکان گرتے ہوئے آدمی پھسلتے ہوئے

مرے لیے تو وہی عرش ہے جہاں قاصر
دُعا کے لفظ ملے ہیں دُھواں اُگلتے ہوئے

درد کو شکل نہ دے آہ کو تجسیم نہ کر
عقل کہتی ہے کسی ربط کو تسلیم نہ کر

لوگ خود ظلم سے مانوس ہوئے جاتے ہیں
تُو ابھی عدل کے منشور میں ترمیم نہ کر

اتنا مخلص ہے تو چل کر ترے گھر آئے گا
رہگزاروں میں کسی شخص کی تعظیم نہ کر

کہیں بدظن نہ ہوں آئندہ بہاریں تجھ سے
اپنے پھولوں کو بھرے شہر میں تقسیم نہ کر

چند شامیں جو لٹکتی رہیں دیوار کے ساتھ
وقت کہتا ہے انھیں شاملِ تقویم نہ کر

○

خفا ہے جو گھر سے کسی بات پر
کبھی غور کر اس کے حالات پر

فقط تجھ کو چھونے کی خواہش میں کی
بہاروں نے بیعت مرے ہاتھ پر

گل آندھی سے بکھرے اُڑی شاخ شاخ
بنے خار منقار اور پات، پَر

نے محرم روح راہِ فرار
ہیں پہرے جسد کی حوالات پر

ملے ہیں جو پتھر پہ نقشِ وفا
وہ تعویذ کندہ کرو دھات پر

بچیں طور سے جو۔ اُترنے لگیں
وہ کرنیں مرے فن کی تورات پر

گلابوں کے نشیمن سے مرے محبوب کے سر تک
سفر لمبا تھا خوشبو کا مگر آ ہی گئی گھر تک

وفا کی سلطنت، اقلیمِ وعدہ، سرزمینِ دل
نظر کی زد میں ہے خوابوں سے تعبیروں کے کشور تک

کہیں بھی سرنگوں ہوتا نہیں اخلاص کا پرچم
جدائی کے جزیرے سے محبت کے سمندر تک

محبت اے محبت! ایک جذبے کی مسافت ہے
مرے آوارہ سجدے سے تری چوکھٹ کے پتھر تک

اداسی موقلم ہے، نقش ہیں رنگِ ملال ابھرا
تمناؤں کے پس منظر سے دل کے پیش منظر تک

وہ دل جس کا مقدر تھا سرِ طورِ طلب جلنا
قیامت ہو گیا قاصرؔ اسی کا بے سبب جلنا

فروزاں ہو کے بھی یہ شمعیں اُس محفل میں کب پہنچیں
غنیمت ہے حروفِ مدعا کا زیرِ لب جلنا

سیاست کی اندھیری رات میں ہم لوگ رکھتے ہیں
وہ شمعیں جن کو آتا ہے بعنوانِ ادب جلنا

جو پہنچیں شہر میں اب وہ ہوائیں دیکھ آئی ہیں
چناروں کا بھرے جنگل میں ہو کر منتخب جلنا

گری ہے بے نیازی، کوہِ جاں پر برف کی صورت
بہت مشکل ہے قاصرؔ آتشِ جلوہ کا اب جلنا

O

بکھیر دو کرچیاں خود شکستہ ساعتوں کی
تمناؤں کے ٹکڑے نہ ہوں بے وجہ زخمی

نہ موجوں کی جوانی نہ اب وہ بے کرانی
ہوا ہے خشک پانی رواں ہے پھر بھی کشتی

کبھی پتّوں میں سمٹی کبھی شبنم کو اوڑھا
کلی گلشن میں آکر بہت شرما رہی تھی

زمیں سے جب بھی اُٹھّی اُڑی دوشِ ہوا پر
ملی ہے خاک کو بھی سلیماں کی انگوٹھی

ہمارا جسم ناصرؔ کھنڈر ہے مدّتوں کا
یہیں عفریتِ غم کے یہیں آسیبِ ہستی

○

ڈور کے چاند نے کچھ راستے چمکائے ہیں
ورنہ اس رات کے دامن میں فقط سائے ہیں

جن کے عنوان سرابوں نے سنائے تھے ہمیں
پانیوں نے بھی فسانے وہی دہرائے ہیں

اعتبار اپنی ہی رنگت پہ نہیں چہروں کو
حدّتِ گرد سے یوں آئنے سنولائے ہیں

پھر نہ گھر جائیں کسی شہر کے ہنگاموں میں
ہم بیاباں سے بہت دُور نکل آئے ہیں

گل سے مہکار چلی توڑ کے رنگوں کے حصار
اے صبا! کس نے سلاسل اسے پہنائے ہیں

ہم سے مایوس نہیں ہے ابھی تنہائی کہ ہم
ان کی محفل سے بہت اشک بچا لائے ہیں

جاگتا ہوں تو بکھر جاتا ہوں کرنوں کی طرح
اتنے سُورج مری نیندوں میں سمٹ آئے ہیں

آگ درکار تھی اور نور اٹھا لائے ہیں

ہم ہتھیلی پہ عبث طور اٹھا لائے ہیں

کیا ازل ہی سے یہی قحطِ بصیرت تھا کہ لوگ

دیکھ کر ۔ دیدۂ بے نور اٹھا لائے ہیں

دل کی راہ میں ہے آئینِ محبت برحق

درد، قابیل کا منشور اٹھا لائے ہیں

شیشہ سازوں کے نئے دام میں آنے والے

دل کے ٹکڑے بھی بدستور اٹھا لائے ہیں

اپنے شانوں سے کسی زخم سے آگاہ نہیں
تختِ شاہی کو جو مزدور اُٹھا لائے ہیں

اب تو ماضی کے کھنڈر اور بھی ویراں ہیں کہ ہم
حادثے جو بھی تھے مشہور اُٹھا لائے ہیں

اس نے پھینکا ہے زمیں پر تو کوئی بات نہیں
ہم بھی جنّت کو بہت دُور اُٹھا لائے ہیں

○

گیسو گیسو بھٹکی خوشبو عارض عارض ٹھہرا رنگ

جانے کس کو ڈھونڈ رہے ہیں اندھی خوشبو بہرا رنگ

ٹوٹ گئی وہ دستِ فلک میں تھی جو کمانِ قوسِ قزح

آخر ابرِ آوارہ پر کب تک دیتا پہرا رنگ

سورج لاکھ ہو نازاں کرنوں کے طوفانِ تبسم پر

شام شفق میں بھر جائے گی مایوسی کا گہرا رنگ

کون اس کو دُنیا کی نمائش گاہ میں آویزاں کرتا

جس تصویر کی قسمت میں تھے دوہرے نقش اکہرا رنگ

صحنِ چمن ہے ایک عدالت، پتے ضامن، خار وکیل

منصف کلیاں، شاہد خوشبو، مجرم پھول، کٹہرا رنگ

○

غم کے نصاب میں شامل تھی ان کے عہد و پیماں کی کتاب
ورنہ ہم خود بھی رکھتے تھے دل کا صحیفہ، جاں کی کتاب

کل اوراقِ دل میں لکھے تھے سود و زیاں کے تخمینے
آج تری نظروں سے گزر کر بن گئے اک عرفاں کی کتاب

بینے والوں کے جمگھٹ میں تھے اکثر اَن پڑھ انسان
بازاروں میں بکتے دیکھی کل ہم نے یزداں کی کتاب

ابوابِ غارت کا اضافہ موسم سے منسوب نہ کر
ہر کانٹے کو نوکِ زباں ہے آج گُلِ خنداں کی کتاب

کہیں دریدہ، کہیں ہیں دھبے اور کہیں ہاتھوں کے نشاں
ہستی کا پیراہن ہے یا طفلِ ابجد خواں کی کتاب

وصل کے لفظ، فراق کی سطریں، یاد کے صفحے، غم کے ورق
کتنی پھیل گئی ہے ناصرؔ عشق کے اک عنواں کی کتاب

○

مایوسیوں کو شکر کے سانچے میں ڈھال کر
اے شوقِ نامراد! خُدا سے سوال کر

وہ گوہر آج بحر کی تہہ میں اُتر گیا
لائی تھیں جس کو سطح پہ موجیں اُچھال کر

تجھ سے مٹیں نہ مشرق و مغرب کی دُوریاں
اے مہر! اب طوافِ جنوب و شمال کر

پندار کو شکست کا احساس کھا گیا
زندہ کہاں رہا ہوں مَیں ہتھیار ڈال کر

ہر آدمی پہ سانپ کا ہونے لگا گماں
یارب مری نگاہ کی قوت بحال کر

ناصرؔ نے رخ پہ جمنے نہ دی منزلوں کی گرد
آنکھوں سے کوئے یار کی راہیں نکال کر

دسمبر ۱۹۷۱ء

نظر نظر میں ادائے جمال رکھتے تھے
ہم ایک شخص کا کتنا خیال رکھتے تھے

عمل : اسلم کمال

بھونچال سے معاہدے آتش سے ساز باز
شاید پہاڑ بھی ابدیت سے ڈر گئے

اِک پیش گوئی ہے کہ جہاں ڈوبتے ہیں شہر
خطرے کے اس نشان سے دریا اُتر گئے

برسے کہیں تو ساتھ اندھیرے بھی لائیں گے
بادل، جو اک شعاع کی آواز پر گئے

○

ترا خیال جو خوابوں میں بھی خبر دے گا
تو عشق جاگ کے بیٹھے کو قتل کر دے گا

جو مطمئن ہو تو آنکھوں پہ شکر کرتے رہو
کرو سوال تو وہ دولتِ نظر دے گا

رہِ کمال پہ یہ اُونگھتے ہوئے مہ و سال
زوال ہی اُنھیں اب جراُتِ سفر دے گا

دِلوں کے شہر پہ شبخون مارنے والا
مجھے شکستِ نظر کے محاذ پر دے گا

اُلجھ نہ مہر سے تُو اے مری شبِ تاریک
وہ جگنوؤں کے پروں میں شعاعیں بھر دے گا

بدن پہ رُوح کا ہر کرب لکھ دیا ہے ہو تو کیا؟
وہ مل گیا تو توجہ لباس پر دے گا

ہر لفظ سُن کے حکم رہائی خموش ہے
اک شخص بولتا ہے خدائی خموش ہے

اسرار ہے کوئی پسِ اظہارِ آرزو
جس کو ملا ہے اِذنِ صفائی، خموش ہے

ظلمت کی انجمن میں صداؤں کے قمقمے
جو بھی ہے روشنی کا فدائی، خموش ہے

شاید سماعتیں ہی رفاقت کی شرط ہیں
پانی کی لب کشائی پہ کائی خموش ہے

فطرت تو ہے ہی مہر بہ لب کیا گواہی دے
بھائی ہوا ہے قتل تو بھائی خموش ہے

○

آنسو ہیں ترجمانِ دل

اب تو سمجھ زبانِ دل

مسندِ عدل پر ہے تُو

سُن تو سہی بیانِ دل

جُھک کے زمینِ حُسن سے

ملتا ہے آسمانِ دل

ناقۂ آرزو کے ساتھ

چلتا ہے ساربانِ دل

سارے مکیں تھے محوِ خواب

جلتا رہا مکانِ دل

کھڑے ہیں درد کے کھنڈر

ملتا نہیں نشانِ دل

○

دل کی تنہائی انجمن میں بھی ہے
ایک دیوار جان و تن میں بھی ہے

تیری یادیں بسی ہیں سینے میں
دل مسافر بھی ہے وطن میں بھی ہے

رُوح کو چھوڑ کر کہاں جائے ؟
فاصلہ درد اور بدن میں بھی ہے

دن کو سُورج نہ تھا زمیں پہ کہیں
شب کو اُمید کی کرن میں بھی ہے

اُس کے چہرے پہ گرد جمنے نہ دے
اتنی تاثیر میرے فن میں بھی ہے

○

تیرتا تھا پھول جو تالاب میں
گھر گیا شاید کسی گرداب میں

جاگنے تک کس سے ہوگا انتظار؟
اب تو تعبیریں ہیں شامل خواب میں

زرد پتّے کو حقارت سے نہ دیکھ
یہ بھی شامل ہے خزاں کے باب میں

دو پرندے لڑ رہے ہیں پیڑ پر
جنگ جاری ہے مرے اعصاب میں

ادائے فرض پہ مامور کر گئی وہ نظر
ہمیں تو عشق پہ مجبور کر گئی وہ نظر

کچھ اس خلوص سے اُٹھی پئے جراحتِ جاں
کہ زخم زخم کو ناسور کر گئی وہ نظر

ہر ایک پھول ہے شاہد کہ چشمِ نرگس کو
بھری بہار میں بے نور کر گئی وہ نظر

بھٹک رہے ہیں خلاؤں میں اس لیے کہ ہمیں
زمیں سے دور۔ بہت دور کر گئی وہ نظر

ملال یہ ہے کہ جامِ سفال ٹوٹ گیا
سرور یہ ہے کہ مخمور کر گئی وہ نظر

○

اسی احتیاط سے نے شوق کو سرِ دشت تیرا پتا دیا
کہ ہوائے تند نے، ریت پر جو لکھا ہوا تھا مٹا دیا

میں تو مدتوں سے خموش ہوں اسے کس نے حکمِ صدا دیا
کہ جہاں سے کوہِ ندا نے پھر ترا نام مجھ کو سنا دیا

جو سکوت دشت میں بند ہے کبھی شہر تک وہ پہنچ گیا
تو یہ دیکھنا کہ صداؤں کے جو کھنڈر ہیں ان کو گرا دیا

وہ بلندیاں ہوں کہ پستیاں سبھی فیصلے ہیں نگاہ کے
کہیں خود زمیں پہ جھک گئی کہیں آسماں کو جھکا دیا

O

رنگ بدلتے رہنا انساں کی مجبوری ہے
وصل کے موسم میں خاکی ہے ہجر میں نُوری ہے

اُجرت میں دریا کا رُخ لائی ہے اپنے ساتھ
ساحل پر جو موج اب تک محوِ مزدوری ہے

پس منظر کے پھُولوں میں ہیں عارض، آنکھیں، ہونٹ
اور دیکھوں تصویر تو تیری شکل اُدھوری ہے

اہلِ محفل کی باتوں میں لہجہ پیاروں کا
اور مری پہچان فقط اِک شخص کی دُوری ہے

لفظوں کے کمزور مسافر معنی کے ظلمات
راہ میں اس کے نام کی اِک قندیل ضروری ہے

○

زلف و رخسار کا جب خیال آئے گا شب کو دامن میں لے کر سحر آئے گی
اپنی نظروں کو بیدار ہونے تو دو ہر طرف اُس کی صورت نظر آئے گی

نیند آئی تو خوابوں میں ڈر جاؤ گے جاگ اُٹھے تو فضا میں بکھر جاؤ گے
ایک آواز در سے گزر آئے گی ایک تصویر دیوار پر آئے گی

زندگی کو گریزاں جو پاؤ گے تم اپنی ہی ذات میں ڈوب جاؤ گے تم
پھر ہر اک بات پر ہونٹ سل جائیں گے مسکراؤ گے تو آنکھ بھر آئے گی

اپنے جلوے دکھائے گی جب یہ زمیں ذرہ ذرہ لگے گا تمھیں پھر حسیں
دل کا یہ سلسلہ توڑنے کے لیے اک پری آسماں سے اُتر آئے گی

دل میں جو پھول کھلتا تھا سب موسموں سے میں اس کا تعارف کراتا رہا
کیا خبر تھی کہ گلشن کو جاتے ہوئے ہر خزاں پہلے قاصر کے گھر آئے گی

کھلے تھے لفظ گلابوں کی داستاں کیلئے
لبوں کی سُرخ سلامی نہ تھی خزاں کے لیے

ندی میں چاند کھلاتا ہے انعکاس کے پھول
ازل سے بہتی شعاعوں کے کارواں کے لیے

مرے بدن پہ منقش ترے لباس کے پھول
یہ ریگ زار ہے توسیعِ گلستاں کے لیے

کھلے نہ کشتِ سماعت میں التماس کے پھول
یقیں کی فصل جلادی گئی گماں کے لیے

دیارِ جسم میں چاروں طرف کپاس کے پھول
مگر وہ سر جو ترستا ہے سائباں کے لیے

زمین چُنتی رہی سر برہنہ آس کے پھول
بُنی تھی شال ستاروں نے آسماں کے لیے

اُداس پائے گئے آج آس پاس کے پھول
یہیں ملول تھا بچہ کل اپنی ماں کے لیے

لبِ فرات کھلائے ہیں تُو نے پیاس کے پھول
گدائے آب ہے قاصر جوازِ جاں کے لیے

پہلے اِک شخص میری ذات بنا
اور پھر پُوری کائنات بنا
عمل: اسلم کمال

نظمیں

حمد

میں پیاسا تھا
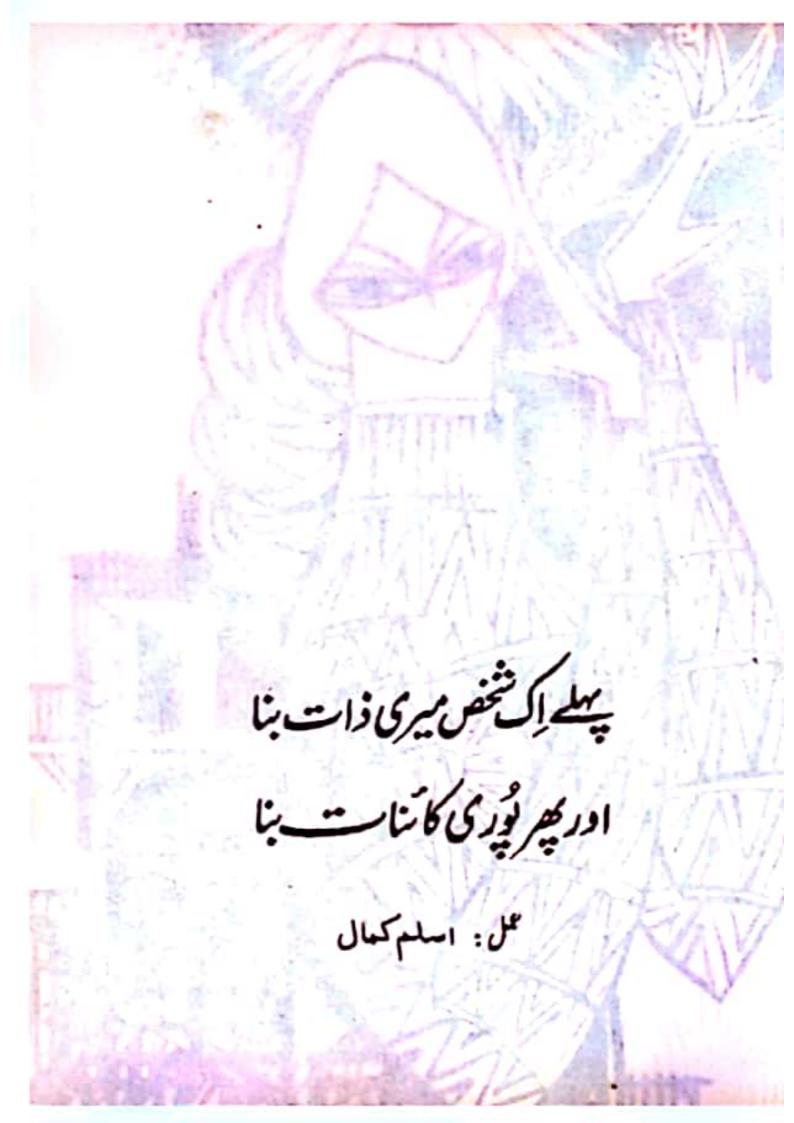
زمیں پر اُس نے ہر سُو پانیوں کے جال پھیلائے

مرا جسم برہنہ دیکھ کر ذرّوں کی عُریانی کو سبزے کی ردا بخشی

مرے گھر میں اندھیرا دیکھ کر اُس نے فلک پر چاند تاروں کی کئی شمعیں جلائیں

مجھے پھولوں کی چاہت تھی تو گلشن کے ہر اِک کانٹے کو اپنی نکہتیں تفویض کیں

اُس نے

مری محرومیوں کو سب مناظر کی نگہبانی کا فرضِ دلنشیں بخشا

وہ میری جاگتی آنکھوں کو نادیدہ جہانوں کے کئی قصّے سناتا ہے

تھپک کر رات بھر مجھ کو سُلاتا ہے

مرا دل خود کو اس کے سجدۂ بے لوث پر مجبور پاتا ہے

نعت

سائل کے سامنے شہِ کون و مکاں بھی ہیں
دامن میں دیکھتا ہوں تو دونوں جہاں بھی ہیں

میزانِ عاشقی میں برابر ہیں عرش و فرش
نقشِ قدم تمہارے یہاں بھی وہاں بھی ہیں

پتھر بندھے ہیں پیٹ پہ سوئے ہیں خاک پر
قدموں میں کہکشائیں لیے آسماں بھی ہیں

سرمایۂ چمن سہی تیرے لبوں کے پھول
انساں کی عظمتوں کے مہکتے نشاں بھی ہیں

قاصرؔ جو دل غلامِ محمدؐ نہ بن سکے
وہ مبتلائے سحر گماں ہیں جہاں بھی ہیں

ایک ذاتی نظم

میں اکثر دیکھنے جاتا تھا اُس کو جس کی ماں مرتی
اور اپنے دل میں کہتا تھا یہ کیسا شخص ہے ؟ - اب بھی
جیسے جاتا ہے - آخر کون اس کے گھر میں ہے جس کے
لیے یہ سختیاں سہتا ہے تکلیفیں اُٹھاتا ہے
تھکن دن کی سمیٹے شب کو گھر جانے پہ کون اس کے
لیے دہلیز پر بیٹھا ـــــ دُعا کی مشعلیں دل میں
جلائے ـــ دیدۂ بے خواب کی ہر راہ دروازے
کی درزوں سے نکلے گا ـــ خدا کی مہربانی اِک
حقیقت ہی سہی کچھ قہر آلودہ بھی ہے ـــ جو اس
کی نافرمانیاں کرتے ہیں ان کے واسطے اس نے
دہکتی آگ بھی تیار رکھی ہے ـــــ دلِ کافر
میں اس کی مہربانی اور رحمت کا تصوّر بھی
جب آیا ماممتا کے لفظ کی صورت میں آیا ہے

مری ویران آنکھوں نے پھر ایسا وقت بھی دیکھا
کہ سُورج جل رہا تھا روشنی منظر سے غائب تھی
خدا زندہ تھا لیکن اس کی رحمت سر سے غائب تھی
انہی آنکھوں میں میرے خیریت سے لوٹ آنے پر
نہ تھا اشکِ مسرت بھی ـــــ کہ میری راہ تکنا جن
کی بینائی کا مصرف تھا ـــ وہ لب دو چار دن پہلے
مرے ماتھے پہ ہو کر ثبت جو کہتے تھے "تم جاؤ
تمھاری نوکری کی بات ہے بیٹے! میں اچھی ہوں
مجھے اب جان کا خطرہ نہیں ہے اور اگر کچھ ہو
گیا تو ہم تمھیں فوراً بلا لیں گے ـــــ چلے جاؤ"
(اگر مر جاؤں میں تو صبر کر لینا ـــــ خدا حافظ)
مگر یہ بات ناگفتہ ان لبوں سے کب سُنی میں نے
اسے معلوم تھا شاید کہ مائیں مر نہیں سکتیں
دلِ اولاد میں اِک یاد بن کر زندہ رہتی ہیں
بلایا تو گیا مجھ کو مگر وہ لب؟ کہاں وہ لب؟
مرے فاقہ زدہ بچپن کو نیندوں سے گریزاں پا

کے جو پریوں کے افسانے سناتے تھے تو میں خوابوں
میں خود کو ان کے دسترخوان پر موجود پاتا تھا
سکت باقی نہیں ہے ان لبوں میں آج اتنی بھی
کہ میری خاطر اِک حرفِ دُعا کا بوجھ اُٹھا لیتے
مجھے جو دیکھنے آتے ہیں کہتے ہیں میں زندہ ہوں
میں کھاتا ہوں کہ یہ بھی زندگی کی اِک ضرورت ہے
مگر ہر ذائقے میں ایک تلخی کا اضافہ ہے
کسی دیوار کا سایہ ہو یا ہو پیڑ کی چھاؤں
مرا جسمِ برہنہ چھیدتی رہتی ہیں کرنیں اب
ہُوا وہ ہاتھ غائب جو کہ میری ذات پر ہوتے
ہوئے ہر وار کو بڑھ بڑھ کے خود پر روک لیتا تھا
دُعا کو ہاتھ اُٹھاتا ہوں دعائیں اس کی خاطر ہیں
میں گویا ہوں کہ میری سب صدائیں اس کی خاطر ہیں
محبت اس کی خاطر ہے وفائیں اس کی خاطر ہیں
کہ میری ابتدائیں، انتہائیں اس کی خاطر ہیں

سیلاب کے بعد

(نومبر ۱۹۷۰ء میں سابقہ مشرقی پاکستان کے سیلاب سے متاثر ہو کر)

ہُوک سی دل میں اُٹھی رات کے سناّٹے میں
اور پھر درد کی لہروں میں کہیں ڈُوب گئی
آسماں جس پہ فدا تھا وہ زمیں ڈوب گئی
غم کے اتمام میں، نے عشق کی تکمیل میں ہے
جو مزہ حُسن کے ارشاد کی تعمیل میں ہے
موت وہ نوح کا طوفاں ہے کہ جس کے آگے
زیست کہسار کی چوٹی کے سوا کچھ بھی نہیں
خامشی گوُنجے تو پھر صوت و صدا کچھ بھی نہیں
زیست کی جنسِ گراں موت کی تحویل میں ہے
لشکرِ عمرِ رواں رہگذرِ نیل میں ہے

چند بے رنگ لکیروں سے اُبھر کر خدّ و خال

ڈوبتے جاتے ہیں رنگوں کی فراوانی میں

نقش ملبوس ہیں کیوں جامۂ عُریانی میں

نہ تو تشبیہہ سے ظاہر ہے نہ تمثیل میں ہے

رازِ تخلیق جو فن کار کی تخئیل میں ہے

ذہنِ شاعر پہ تو روشن ہے بیاضِ ہستی

کہ روانی ہے کہاں اور کہاں سکتہ ہے

مصحفِ لفظ کے قاری پہ یہ راز افشا ہے

حفظِ معنی تو فقط صورتِ ترتیل میں ہے

لفظ اکثر ہیں غریب، اس لیئے تعجیل میں ہے

ارضِ ہستی کے کھنڈر کا یہ بھیانک عفریت

اپنے آئین کی ہر شق کو بدل دیتا ہے

سعیِ تخریب سے پہلے ہی کچل دیتا ہے

سنگِ افلاک جو منقارِ ابابیل میں ہے

آیۂ موت ہی بس وقت کی انجیل میں ہے

خزاں سے گفتگو

اے خزاں !

سازِ غم ! سوزِ اَلم ! بربطِ دل ! نغمۂ جاں
اور موسم ہیں — مگر ان میں یہ انداز کہاں ؟
گرمیاں آئیں تو جذبات بھڑک اُٹھتے ہیں
سردیاں آئیں تو احساس بھی جم جاتا ہے
بُھول جاتے ہیں بہاروں میں ہم اپنی اوقات
درد تو وقت ہے کیا وقت بھی تھم جاتا ہے؟
دولتِ دردِ جہاں عام ہُوئی تیرے طفیل
نیلگوں چرخ ہی کیا ہے شفقِ سُرخ کو بھی

زرد لمحات کا اعجاز دکھایا تُو نے
گُل کو انجام کا احساس دلایا تُو نے
برگ کو خاک کی مسند پہ بٹھایا تُو نے
شاخ کو وقت کے قدموں پہ جھکایا تُو نے
رنگ کو موت کا پیغام سنایا تُو نے
بُو پہ ڈالا غمِ ایام کا سایہ تُو نے
تُو نہ ہوتی تو ہم آہنگِ بقا ہو جاتے
گُل تو گُل ہیں یہی کانٹے بھی خدا ہو جاتے

دو فن کار ۲

شعور و عرفانِ ذات کے جانگداز لمحوں کی خلوتوں میں
شعارِ تخلیق ظلمتوں کے دبیز پردوں سے چھن رہی تھی
وہی تو یکتا تھا جس کے ہاتھوں دوئی کی تصویر بن رہی تھی
جب اُس نے دیکھا کہ نقشِ بے حس میں جُرأتِ ارتعاش بھی ہے
اسے کسی کی تلاش بھی ہے
تو ماں کی مانند لوریوں کی بیاض پڑھ کر
جلائیں بیداریوں کے آنگن میں خواب کی دلفریب شمعیں
کہ میرا سونا ہی اس کے ہر وقت جاگنے کی دلیل ٹھہرا
میں اپنے بستر کی سلوٹوں پر رقم کروں رتجگوں کے دو چار ہندسے بھی

تو پھیل جاتے ہیں چشمِ بینا کے سارے رستے پہ اندھے سائے

اندھیری شب ہے

اُٹھائے قندیلِ آگہی میں بھٹک رہا ہوں

وہ مطمئن ہے کہ کوئی ذرّہ نہ بن سکا روکشِ ستارہ

میں خیر کا بن کے استعارہ صلیبِ شر پہ لٹک رہا ہوں

یہی تو میرا کمالِ فن ہے

یہی تو اُس کا کمالِ فن ہے

دو تحریریں

اِک شخص کا عکس چار سُو ہے
ہر گُل کو گلاب لکھ رہا ہوں

آنکھوں پہ ہیں قرض اس کے جلوے
پلکوں پہ حساب لکھ رہا ہوں

اشعار

بلاتی ہیں مجھے مے کی دکانیں — میں نہیں پیتا
یہ بات آنکھیں تری مانیں نہ مانیں — میں نہیں پیتا

بھلا کر اپنے گرد و پیش کے اندوہ گیں منظر
نہیں بھاتیں مجھے اونچی اڑانیں — میں نہیں پیتا

نشے کی ضرب سے یا خود فراموشی کے تیشے سے
نہیں کٹتیں حقائق کی چٹانیں — میں نہیں پیتا

غم اللہ کی امانت غم غلط کرنا خیانت ہے
نہ مانیں آپ تو پھر آپ جانیں — میں نہیں پیتا

خودی کو جادۂ خطِ سبو پر ڈولتے پا کر
نجومِ صبح دیتے ہیں اذانیں — میں نہیں پیتا

ڈرائیں جن کو دشتِ آگہی کی وسعتیں قاصر
وہ جا کر میکدوں کی خاک چھانیں — میں نہیں پیتا

انسپکشن نوٹ

خدا کے آفس میں دوپہر کو
فرشتے سروس بکس اُٹھائے ہوئے کھڑے تھے
کہ ہر ملازم کی سیلری دو تہائی تخفیف چاہتی ہے
تباہیوں کی ہر ایک فائل
کہ جس میں سیلاب، زلزلوں، قحط اور وباؤں کے
کیس پُٹ اپ تھے
بس انی شل کی منتظر تھی
مفادِ عامہ کے سیکشنوں میں
کلرک میزوں پہ سو رہے تھے

بلاؤں کا نزول

آہٹیں دہلیز پر آکر رُکیں
دستکیں دینے لگی در پر ہوا

کرب، چاپوں کا گلی سنتی رہی
گھر کے اندر بے حسی کا جشن تھا

اور گہرا ہو گیا زخمِ سکوت
جب لگا آکر کوئی تیرِ صدا

آندھیاں، اولے، بلاؤں کا نزول
شہر طوفانوں کی زد میں آگیا

اب تو جو کہہ دے کہ میں محفوظ ہوں
دل اسی کو مان لیتا ہے خدا

مطالبہ

کُھل بھی قفلِ نادانی !
کُھل کر سب پہ ظاہر ہو
نفع — جو زیاں ہیں سب
شوق — جس کی شہہ پا کر
توڑ کے کھلونے کو
ناچنے لگا بچّہ

۱۹۷۳ء

شبِ رفتہ کا سفیر

(مجید امجد کی یاد میں)

شبِ رفتہ

تقدیرِ تاب آئینے بانٹنے کے لیے

عرشِ تخیل سے جب وہ اُترا تو لوح و قلم اس کی تعظیم میں سربسجدہ ہوئے

اور درختِ ابد شاخ در شاخ اس کی ثنا خوانیاں کر رہا تھا

کہ وہ منجمد ساعتوں کے حوالے سے

جب آگہی کے صحیفوں کو قرطاس پر منتقل کر کے

بارِ وفا سے سُبکدوش ہو گا

تو شب رنگ لمحات کو بس اسی کی چمکتی ہتھیلی پہ ایمان لانا پڑے گا

یہاں عکسِ مشّاق لوگوں سے حملے کرا کے

زمانے کے رحم اور ہمدردیوں کے اس انبار میں دب گئے تھے

جسے بے نواؤں میں تقسیم کرنا ہی ان کا جوازِ بقا بن گیا ہے

شبِ رفتہ

تقدیرِ نابِ آئینے بانٹنے کے لیے
آنے والا
"وہ پیدل کہ جس کو جلوسِ جہاں سے فقط ٹھوکروں کی روایت ملی ہے"
روایات کے سدرۃ المنتہیٰ کا لرزتا ہوا زرد پتّا
عدم کو یہ شادابیاں جس نے سمتِ سفر کے تعین سے دیں
لمسِ زنجیرِ تخلیق سے
خود ہی اِک حلقۂ ارتقا بن گیا ہے

اقبال اور ہم

تصوّرِ انقلاب دے کر
گیا معلّم کتاب دے کر

نواگرِ درد سب دلوں کو
گیا دھڑکنے کی تاب دے کر

شکستِ تعبیر ہم نے دیکھی
گیا تھا وہ ہم کو خواب دے کر

سوال تھا زندگی کا. شاید
گیا مسیحا جواب دے کر

جینے کی کوشش

دیکھنا ، دُور جانے والوں کو
سُننا ، اُلجھے ہوئے سوالوں کو
سونگھنا ، اپنے خشک بالوں کو
چھُو کے چکھنا ، گرے نوالوں کو

میں ورائے حواس رہتا ہوں
آپ کے آس پاس رہتا ہُوں

آنکھ شبنمی سی تھی رُخ پہ برہمی سی تھی
آج کچھ کمی سی تھی سادگی کے رنگوں میں
عمل : اسلم کمال

ASLAM KAMAL
78

تسلسل

(دُوسرے آدم کا سہرا)

آپ کے ہونٹ خُوب صورت ہیں
آج عہدِ وفا ضروری ہے
چاندنی کو گواہ ٹھہرا کر
شب، ستارے نثار کرنے لگی

ناقص العقل آنسوؤں کی برات
اور اُمّ البشر کی ڈولی ہے
سعیِ تجدید کر رہی ہے حیات
کتنی سادہ ہے کتنی بھولی ہے

۱۱۶

سب صحیفوں کے لفظ زندہ ہیں
آؤ مفہوم کو تلاش کریں
صرف کردار ہو گئے تبدیل
ورنہ یہ داستاں پرانی ہے
عہد نامے فنا نہیں ہوتے

چار جانب سکوت کے پہرے
اور اِک بولتے جزیرے پر
ایک سائے نے دوسرے سے کہا
آپ کے ہونٹ خوب صورت ہیں

ناکامی

اِک لمحہ جو افلاک سے اُترا برسوں میں
اور دیکھتے دیکھتے پھیل گیا تھا عرصوں میں
(جب رِستا ہوا اِک زخم کِھرا تھا نرسوں میں
سب لڑکیاں گُم تھیں اپنے اپنے پرسوں میں)

روپوش ہوا کملائے بدن کی سرسوں میں
اب کس کی تلاش میں سرگرداں ہیں بحر تو مے؟

مصرف

غصّہ ، نفرت ، گالی ، طعنے میرا ایسا سرمایہ ہیں
میں سارے حاجت مندوں میں جس کو برابر بانٹ رہا ہوں
آپ نے دیکھا میری گلی کا کوئی گدا بدحال نہیں ہے

پھر بھی میرے پاس بچا ہے فاقوں کا بے انت ذخیرہ
جس کو وقت آنے پر اپنے بچّوں میں تقسیم کروں گا

پرستان میں آدم زاد

اور پھر اُس نے کہا: "آنے کو ہے دیوِ سیاہ

جس کے جبڑوں سے لہو رستے ہوئے اور جواں پستے ہوئے

دیکھ کر پھول جھنک اُٹھتے ہیں جنگل جنگل۔

سُرمئی ابر نکل آیا ہے سُرخ آندھی سے

یہ چھنکتی ہوئی بوندوں کی پھوار

اسی بے مہر کے آنے کی علامت ہے کہ جو کمسنی میں مجھے ماں باپ کے آنگن

سے اُٹھا لایا تھا"

اے حسیں بنتِ حسیں!

میرے کانوں کے دریچوں سے معلق ہے یہ کیسی آواز؟

ایک پُر ہول صدا

آدم بو —— آدم بو

مجھ کو ہے علم یہاں میں ہوں وہی آدم زاد

جس کی زد میں ہے فلک اور زمیں

دشت ہے ایک بگولہ جس کا

دُور تا حدِ نظر پانیوں کی نیلاہٹ

عہدِ طفلی میں ہے جھُولا جس کا

مسکراتی ہوئی ہر برق کے ہونٹوں پہ جواں لمحے کی تصویر بنائی جس نے ـــ

جس کے ہاتھوں پہ اگر جھرّیاں آجائیں تو کرنوں کا گماں ہوتا ہے

جن سے بُن لیتا ہے تہذیب کے تانے بانے

یہی دانش کا لبادہ ہے جو اندر کے کسی وحشی کو

لاکھ کوشش سے بھی عُریاں کبھی باہر نہیں آنے دیتا

قافِ آلام کے غاروں میں نہاں رہ کر بھی

جہل و ظلمت کی ہر آہٹ پہ جو چونک اُٹھتا ہے

جس نے ہر موڑ کو محسوس کیا

جو ہر اِک راہگذار سے گزرا

ہاں اُسے . . . .

آج کے جادۂ جانکاہ سے ڈر لگتا ہے

دیو کے حلق میں جانے سے بچالے مجھ کو

اس نئی رہ کی مسافت سے چھڑالے مجھ کو

اپنے بالوں میں کوئی پھُول بنا کر ہی چھپالے مجھ کو

دیکھ، میں جنس بدلنے پہ بھی آمادہ ہوں

کھلتے ہیں کشتِ جاں میں ابھی آہٹوں کے پھول
ہر چند انتظار کے موسم گزر گئے
عمل: اسلم کمال
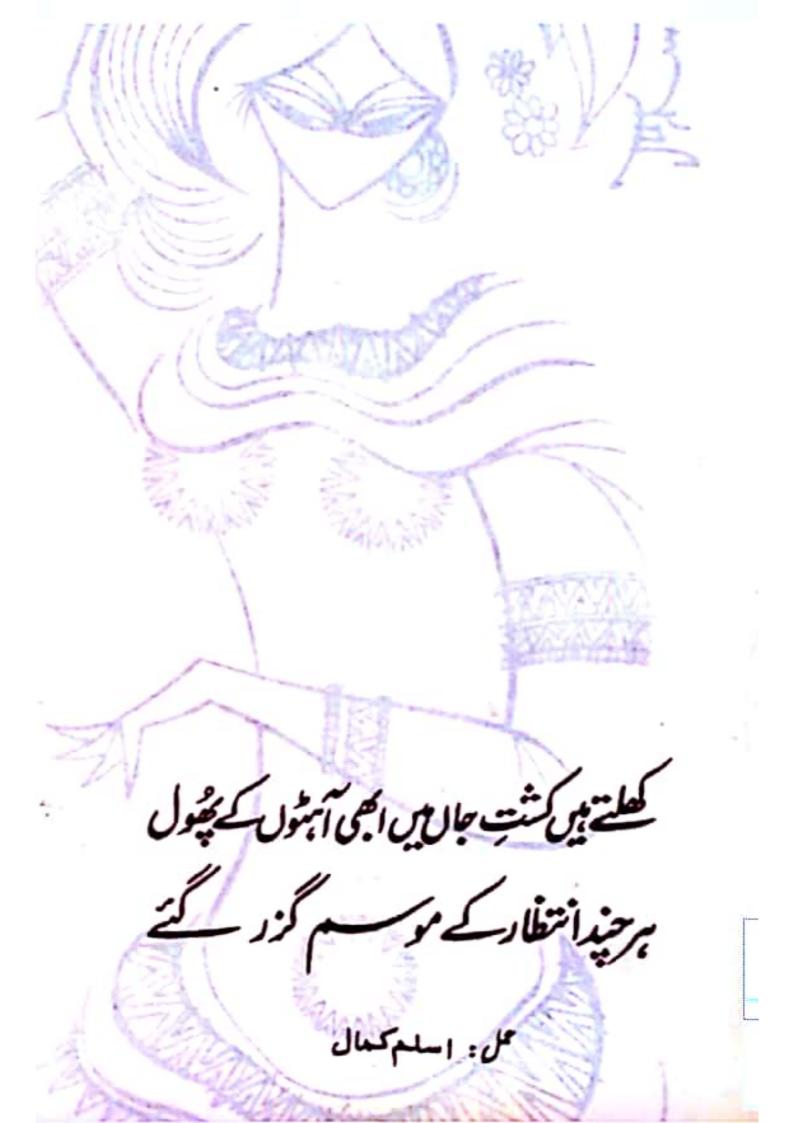
عناصر سے دُور

راکھ میں دبی ہوئی اک چنگاری کے خوابوں کی تعبیریں
جھیل میں تیرتے پھُول کی سرگوشی کے لہجے میں تقریریں
مٹی کے تودے کی پیشانی پر تہہ در تہہ تحریریں
آہوں کے زنداں میں مقفل صوت و صدا کی سب زنجیریں

مٹی !

پانی !

آگ !

ہوا !

ہیں ان سب سے جُدا

مجھ سے الگ دیوار پہ لٹکی آمنے سامنے دو تصویریں

قطعات

○

رہ نوردوں کی رہنمائی کر
غم نصیبوں کی دلربائی کر
ہم کو انساں بنا دیا تُو نے
آ غمِ یار! اب خدائی کر

○

چین کافور ہو گیا ہو گا
زخم ناسور ہو گیا ہو گا
کون رہتا ہے زر پرستوں میں
کوئی مجبور ہو گیا ہو گا

○

دل میں وہ جوشِ کیف و مستی ہے
جس کو وہ آنکھ بھی ترستی ہے
بامِ فرقت سے میرے سینے پر
رات بھر آگہی برستی ہے

○

پالیا تھا جس کو میں نے وہ اچانک کھوگیا
عشق کے بیدار ہوتے ہی مقدر سوگیا
خواہشوں میں ایک خواہش کی کمی واقع ہوئی
حسرتوں میں ایک حسرت کا اضافہ ہوگیا

عکسِ ریزہ ریزہ

جس شخص کے ہاتھوں میں ہے خنجر اِسے قاتل
کہتے نہیں تم آج تو کل کون کہے گا

اب تک جو لُٹ رہا ہوں اشارہ اُسی کا ہے
میرے لبوں پہ نام دوبارہ اُسی کا ہے

کیا کروں میں یقیں نہیں آتا
تم تو سچے ہو بات جھوٹی ہے

پہچان کے سفر میں خدوخال یاد رکھ
جب آئے گا وہ شکل پُرانی میں آئے گا

غم کتابوں میں نہیں، عشق نصابوں میں نہیں
علم پانی ہے تو مکتب کے سرابوں میں نہیں

چھتوں سے صحن میں سائے اُترنے لگتے ہیں
تو بچّے اپنے کھلونوں سے ڈرنے لگتے ہیں

پھولوں کی مہک ہے تازہ تازہ
گو قبر ہے سو برس پرانی

جہاں ٹھہر نہیں سکتی شعاعِ مہر اِک پل
مری نگاہ وہیں زندگی گزار آئی

ہزار بار مجھے لے گئی ترے در پر
وہ آرزو جو مرے دل میں ایک بار آئی

کسے کلیم کہوں میں کہ تیرے کوچے میں
ہر ایک ہاتھ چمکتا دکھائی دیتا ہے

قاصرؔ وفا کے پیڑ کا قصّہ عجیب ہے
شاخیں کھڑی ہیں بیل کا سہارا لیے ہوئے

الطافِ مستعار کو حاصل کہاں دوام
انجم طلوعِ مہر سے بے نور ہو گئے

جہاں کل ابر نے پانی کی فصل بوئی تھی
وہیں سراب اُگائے ہیں آج صحرا نے

گھوڑے سے گر جاؤ گے ہو کر لہولہان
تن کر میرے ابکو! مت کھیلو چوگان

مفلسی میں بھی دلِ "زرگر" کو سونا چاہیے
تجھ سا اِک زریں بدن پہلو میں ہونا چاہیے

پاس ہو تو دردِ سر ہے اور چلاؤ تو فریب
کھوٹے سکّے کو تو بس پاتے ہی کھونا چاہیے

اب خود رہِ وفا کے نشیب و فراز دیکھ
اُس چشمِ معتبر کی ہمہ دانیوں کو چھوڑ

جوانی میں محبّت کی نظر بیدار ہوتی ہے
یہ شبنم روئے گُل کو دیکھ کر بیدار ہوتی ہے

چہرے سے رنگِ ہوش نمایاں ہوا تو کیا؟
دیوانگی تو خون کی گردش کا نام ہے

"مسلسل شعر کے مطالعہ سے ایسے لگتا ہے کہ غلام محمد قاصر کی غزل وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں میری غزل ختم ہوتی ہے۔"
—————— ظفر اقبال

"..... نئی غزل ایک اجتماعی تجربے سے گزر رہی ہے۔ اس تجربے میں غلام محمد قاصر اپنی نمایاں آواز کے ساتھ شامل ہوئے ہیں۔ انھوں نے بہت سے ایسے گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے جو اس سے پہلے کھُل کر سامنے نہیں آسکے تھے........"
—————— شہزاد احمد

"...... اگر اس کے فن کی نشو و نما کا یہی حال رہا تو آنے والے دنوں کو پگڑی سنبھال کر اس کی اونچائی پر نظر ڈالنی ہوگی۔"
—————— قتیل شفائی

"... اس کے مستقبل کے بڑا شاعر ہونے کا خطرہ ہو سکتا ہے۔"
—————— فارغ بخاری

"..... سادگی اور جذبے کی فراوانی ان کی شاعری کی نمایاں خوبی ہے۔ جدید ہونے کے باوجود انھوں نے جدیدیت کی دھن میں بے راہروی اختیار نہیں کی۔ ان کی منزل واضح اور راستے متعین ہیں..."
—————— احمد راہی

"غلام محمد قاصر کا قلمی نام کیفی قلندر بھی رہا ہے۔ شاید یہ اس نام کی تاثیر ہے کہ اس کے شعروں میں قلندرانہ رنگ بھی ہے اور وہ کیف و کیفیت بھی جو لفظوں کی گویائی سے پیدا ہوتی ہے..."
—————— عبدالعزیز خالد

"جناب غلام محمد قاصر جدید نسل کے ہونہار شاعر اور ادیب ہیں۔ ان کے اشعار کی پختگی ان کے پختہ ذہن اور گہرے مطالعہ کی آئینہ دار ہے۔ ان کے بیشتر اشعار سُنتے ہی دل میں اُتر جاتے ہیں....."
—————— شباب کیرانوی

غلام محمد قاصر
۴ ستمبر ۱۹۴۱ء
پہاڑپور (ڈیرہ اسمٰعیل خان)
ایم اے (اردو)